شمس الرحمن فاروقی*

اردو لغت نگاری کے بعض مسائل

زمانۂ حال میں اردو لغت نگاری کا سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس اردو کا کوئی مختصر لیکن قرار واقعی ضخامت کا جدید لغت نہیں ہے، یعنی ایسا لغت جسے جامع و موجز یعنی (concise) کہہ سکیں۔ ایسے لغت میں وہ تمام الفاظ اور محاورے شامل ہوں گے جن کی ضرورت ادب کے عام طالب علم کو پڑ سکتی ہے۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے جو اردو–انگریزی لغات دستیاب ہیں انھیں اپنے زمانے میں جامع کہا جا سکتا تھا، لیکن اب وہ ناقص اور نامکمل کہے جائیں گے۔ اردو–انگریزی کا جو لغت سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ پلیٹس (John T. Platts) کا لغت ہے جس کا آخری ایڈیشن ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا لہٰذا وہ آج سوا سو برس سے زیادہ قدیم ہے اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کو ہرگز پوری نہیں کر سکتا۔

مثلاً *Platts* میں لفظ 'آتش گیر' درج نہیں ہے۔ نور میں یہ لفظ ہے، مگر اس کے معنی 'دیپنا، چمٹا' لکھے ہیں۔ اب 'چمٹا' کی جگہ 'دست پناہ' (نور میں درج نہیں ہے) یا 'دیپنا' شاید اکا دکا لوگ بولتے ہوں، لیکن اب یہ لفظ (آتش گیر) 'آگ تیزی سے پکڑنے والی شے، یا آگ تیزی سے پھیلانے والی شے' کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے incendiary کہتے ہیں۔ حقی صاحب کے لغت میں incendiary کے کئی معنی دیے ہوئے ہیں، ان میں 'آتش گیر' بھی ہے۔

اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ اس زمانے میں اردو کے ایسے طالب علم شاذ ہیں جن کی انگریزی استعداد اتنی ہو کہ وہ پرانے زمانے کے ان اردو۔انگریزی لغات سے فائدہ اٹھا سکیں۔لیکن اگر ایسے طالب علم ہیں بھی تو بنیادی مشکل پھر بھی برقرار رہتی ہے کہ اردو۔انگریزی لغات، اردو کے لفظ کو اردو میں سمجھانے کے وسیلے کے طور پر بیکار ہیں۔یہ بات صرف ان لفظوں ہی پر صادق نہیں آتی جو اصلاً عربی یا فارسی ہیں۔دیسی الفاظ کے بھی معنی جب انگریزی میں بیان کیے جائیں تو ان کی کیفیت کچھ بدل جاتی ہے۔مثال کے طور پر میں نے پلیٹس کا لغت یوں ہی بے ارادہ کھولا تو لفظ 'پوت' پر نگاہ پڑی۔اس کے معنی پلیٹس نے حسب ذیل لکھے ہیں:

A son; the young of an animal; −*putonnahana* v.n.
To be rich in children, be prolific; to thrive,
prosper: −*put* −*zambura*, s.m. A young monkey.

اس بات سے قطع نظر کہ بعض معنی پلیٹس نے بالکل غلط درج کیے ہیں، مجھے شک ہے کہ اردو کا کوئی عام طالب علم prolific جیسے لفظ کے معنی جانتا ہوگا۔اب اگر وہ طالب علم غیر معمولی طور پر تفحص پسند ہوگا اور حقی صاحب کا لغت اس کی مالی استعداد سے باہر نہ ہوگا تو وہ حقی صاحب کے بنائے ہوئے لغت *Oxford English Urdu Dictionary* کو رجوع کرے گا اور وہاں اسے prolific کے حسب ذیل معنی نظر آئیں گے:

بہت سی اولاد، ذریات پیدا کرنے یا بہت سا مال تیار کر لینے والا
۲۔(بعدہٗ of) فراوانی سے پیدا کرنے والا
۳۔(بعدہٗ in)وافر، کثیر، فراواں

اب جو معنی یہاں حسب مطلب ہیں وہ پہلے والے ہیں، یعنی بہت سی اولاد، ذریات پیدا کرنے والا۔ہمارے طالب علم کو یہ تو نہ معلوم ہوگا کہ 'پوتوں نہانا' کوئی محاورہ نہیں اور اگر ہے بھی تو صرف صرف عورتوں کے لیے آتا ہے۔اور پلیٹس کے ادھورے مفہوم کی بنا پر وہ یہ بھی قیاس کرے گا کہ 'پوتوں نہانا' میں اولاد نرینہ کی شرط نہیں، اور نہ ماں یا باپ کی تخصیص ہے۔وہ سمجھے گا کہ بہت سی اولاد پیدا کرنے والے ہر شخص کو 'پوتوں نہانے والا' کہتے ہیں۔لہٰذا وہ جملہ بنائے گا:

ہمارے والد صاحب تو خوب پوتوں نہائے، ہم لوگ دس بہنیں اور پانچ بھائی ہیں۔

استاد صاحب اگر شاگرد سے کچھ زیادہ با صلاحیت ہوں گے تو وہ اس جملے پر خط تنسیخ کھینچ کر صفر نمبر تھما دیں گے۔ شاگرد بیچارہ سر پیٹتا رہ جائے گا۔ اور اگر استاد بھی این خانہ تمام آفتاب است کے مصداق ہوئے تو پلیٹس کی سند پر شاگرد کے جملے پر صاد کا نشان بنا دیں گے۔

اب ذرا 'پوت' کے معنی اردو–اردو لغات میں دیکھیں:

نور اللغات: –بیٹا، فرزند؛ پوتوں پھلے– کثرت سے بیٹے پیدا ہوں

صاحب نـور اللـغـات کو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ مجرد لفظ 'فرزند' بیٹا بیٹی دونوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن انھوں نے مرادفات کی کثرت کا التزام رکھتے ہوئے ایک بالکل غیر ضروری اور غلط لفظ 'فرزند' رکھ دیا۔ نہ ہی انھوں نے یہ بتایا کہ 'پوتوں پھلے' کی دعا صرف عورتوں کے حق میں کی جاتی ہے۔ نہ انھوں نے یہ وضاحت کی کہ اصل محاورہ 'پوتوں پھلنا' ہے اور مکمل محاورہ 'دودھوں نہاؤ/نہائے/ نہانا پوتوں پھلنا/ پھلے/ پھلنا' ہے۔

آصفیہ: –بیٹا۔ پتّر۔ فرزند

صاحب آصفیہ نے لفظ 'پتّر' مع تشدید رکھ کر اور بھی مشکل پیدا کی۔ لغت دیکھنے والا سمجھے گا کہ 'پتّر' اردو میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ خود آصـفـیـہ میں لفظ 'پتّر' مع تشدید درج نہیں ہے، لیکن 'پتر' مع سکون دوم ضرور درج ہے۔ اس اندراج سے بھی لوگوں کو دھوکا ہو سکتا ہے کہ لفظ 'پتر' اردو میں ہے، حال آنکہ یہ حقیقت سے بعید ہے۔ 'پتّر' ہو یا 'پتر' اردو میں مجرد کبھی نہیں آتا۔ آصـفـیـہ نے 'پوتوں نہانا' درج نہیں کیا، اور وہی صحیح بھی ہے کیونکہ پورا محاورہ 'دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو' یا 'دودھوں/ نہائے نہانا؛ پوتوں پھلے/ پھلنا' درج ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ نـور اور آصـفـیـہ دونوں میں 'پوت' کو مخصوص بہ ہندواں لکھا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔

نـور میں 'دودھوں نہانا' درج نہیں ہے، حال آنکہ جب 'پوتوں پھلنا' درج کیا تھا تو 'دودھوں نہانا' بھی درج کرنا تھا۔ نـور میں 'دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو' ضرور درج ہے اور معنی اور مثال سب آصفیہ سے ہو بہو لے لیے ہیں۔ دونوں لغت نگاروں نے محاورے کی مصدری شکل 'دودھوں نہانا پوتوں پھلنا'

درج نہیں کی۔

میں دیگر لغات کا تذکرہ نہیں کروں گا کیونکہ مضمون بہت لمبا ہو جائے گا۔ شاید ہی کسی لغت میں 'پوت' اور 'دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو' کی صحیح تعریف درج کی گئی ہو۔ اتنا اور کہتا چلوں کہ آصفیہ؛ نور اور ترقی اردو بورڈ کراچی کے اردو لغت، ان سب میں 'فرزند' کے معنی 'اولاد نرینہ' لکھے ہیں، حال آنکہ 'فرزند' کے معنی میں اولاد کی جنس کی قید نہیں ہے۔ فرہنگ آنند راج میں 'فرزند' کے معنی یوں درج ہیں:

پسر و دختر ہر دو را گویند

یہی معنی اردو میں بھی رائج ہیں، ورنہ 'فرزند نرینہ' کی ترکیب اور 'زن و فرزند' جیسے فقرے نہ ہوتے۔

پلیٹس سے قدیم تر لغت فیلن (Fallon, ۱۸۹۷ء) میں 'فرزند' بمعنی اولاد نرینہ کی تخصیص تو نہیں ہے، لیکن ان کی عبارت ایسی ہے کہ غلط فہمی کا امکان بہت ہے۔ صرف شیکسپیئر (Shakespeare, 1834) نے 'فرزند' کے صحیح معنی لکھے ہیں:

A child, son or daughter

یہ معنی بالکل درست ہیں۔ ڈنکن فوربس (Duncan Forbes, ۱۸۶۶ء) میں یوں درج ہے:

A child, son or daughter

یعنی یہ شیکسپیئر کی بالکل صحیح نقل ہے۔ فیلن (Fallon, ۱۸۹۷ء) میں ہے:

A son; a child

بظاہر خرابی کی جڑ یہاں ہے، کیونکہ اول معنی A son بتائے گئے جو سراسر غلط ہے۔ اب پلیٹس کو دیکھتے ہیں:

Offspring, child, a son, a daughter

ظاہر ہے کہ offspring تو بالکل ہی غلط ہے، کیونکہ یہ لفظ انسان کے بچوں کے لیے مخصوص نہیں۔ جانور کے بچے کو بھی offspring کہہ سکتے ہیں۔ اور child سے مراد ہو سکتی ہے کوئی

چھوٹا بچہ۔ اگر فیلن اور ڈنکن فوربس کی طرح child لکھ کر son or daughter لکھ دیتے تو بات بالکل صاف ہو جاتی۔ اردو–اردو لغات میں جو افراتفری ہے وہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے شیکسپیئر اور ڈنکن فوربس کو چھوڑ کر پلیٹس، فیلن، آصفیہ، نور اور اردو لغت، کسی نے بھی لفظ 'فرزند' کے معنی پر غور نہیں کیا۔ نور نے آصفیہ سے نقل کیا اور اردو لغت نے ان دونوں کی نقل کی۔

لہٰذا جب 'پوت' اور 'فرزند' جیسے عام الفاظ کے معنی میں طرح طرح کے اغلاط اور اشکال ہیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ اردو–انگریزی یک جلدی لغات بہت معتبر نہیں ہیں، اور خود اردو–اردو لغات بھی پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔ اس وقت یک جلدی اردو–اردو لغات میں جس لغت کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے وہ فیروز اللغات ہے۔ یہ مختصر، متوسط اور کلاں تینوں شکلوں میں دستیاب ہے۔ یہ لغت اب ہندوستان میں بھی بآسانی مل جاتا ہے۔ چونکہ 'پوت' اور 'فرزند' کی بحث نکل پڑی ہے تو لایئے فیروز اللغات بھی دیکھ لیں۔ میرے سامنے اس کا جدید اور کلاں ایڈیشن ہے۔

پوت: بیٹا، پسر، لڑکا، پتر، فرزند

ظاہر ہے کہ 'پسر' اور 'لڑکا' کے سوا باقی معنی آصفیہ سے اٹھا لیے گئے ہیں (بیٹا۔ پتر۔ فرزند)، اس فرق کے ساتھ کہ یہاں 'پتر' بتشدید دوم نہیں ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ پہلے چار الفاظ کو تو 'پوت' کے صحیح معنی کہہ سکتے ہیں، حال آنکہ چار کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن 'فرزند' تو ہرگز درست نہیں ہے۔ اب 'فرزند' کو بھی فیروز اللغات میں دیکھ لیں۔

فرزند: بیٹا، لڑکا

۲۔ اولاد لڑکا یا لڑکی

یہاں بھی آصفیہ اور نور والی عقل کام کر رہی ہے کہ صحیح معنی لکھے لیکن غلط معنی سے گریز نہ کیا، اور غلط معنی کو مقدم کیا۔

اس بحث سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اردو لغت نگاری کے باب میں ہمارا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی یک جلدی اردو–اردو لغت نہیں ہے جسے کم و بیش معتبر سمجھا جا سکے۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی نے یک جلدی لغت شائع کیے ہیں لیکن ان

کا عالم فیروز اللغات سے بدتر نہیں تو بہتر بھی نہیں۔ ان لغات پر بحث کا یہ موقع نہیں کیونکہ گفتگو مسائل پر ہے۔

اوپر کچھ لغات کے حوالے سے کچھ معنی بیان کیے گئے۔ ایک بات پر شاید آپ کی توجہ گئی ہو اور وہ یہ کہ لفظ کے معنی بیان کرنے میں مرادفات کا خوب اہتمام کیا گیا ہے، لیکن یہ ظاہر نہیں ہوا کہ اگر کئی مرادفات ہیں تو کیا ان کا اندراج کسی اصول کے تحت کیا گیا ہے؟ مثلاً نور میں 'پوت' کے معنی لکھے ہیں: 'بیٹا، فرزند'؛ اور آصفیہ میں اس لفظ کے معنی لکھے ہیں: 'بیٹا۔ پتر۔ فرزند'۔ تو کیا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ 'پوت' کے معنی میں 'بیٹا' مرجح ہے، اور 'پتر' اس کے بعد، اور 'فرزند' ان سب کے بعد؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم کسی ایسے اصول سے واقف ہیں جس کی رو سے یہ ترتیب بنائی گئی ہے؟

مجھے افسوس ہے کہ کسی لغت نگار نے کوئی اصول نہیں بیان کیا جس کی رو سے مرادفات میں کسی ترجیحی ترتیب کا اندازہ ہوتا ہو۔ لغت نگار کو مرادفات سے مفر نہیں، لیکن مرادفات اندھا دھند نہیں درج کرنے چاہییں، خاص کر ایسی صورت میں جب کوئی لفظ کسی اور لفظ کا مکمل حقیقی مرادف نہ ہو سکتا ہو۔ ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ زبان میں مرادفات کا وجود نہیں، ہر لفظ اپنی جگہ پر اکیلا اور بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن لغت نگاری کی حد تک یہ بات بھی صحیح ہے کہ کئی لفظ ایسے ہیں کہ جن کا مرادف درج نہ کیا جائے تو لغت نگاری کا حق ادا نہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ ہم نے دیکھا، زیر بحث کسی لغت میں مرادفات کی ترتیب ترجیحی نہیں ہے۔ یا اگر ترجیحی ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ جو ترجیحیں بیان کی گئی ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔ 'پوت' کے معنی میں پہلی ترجیح 'بیٹا' تو درست ہے، لیکن دوسری ترجیح 'پسر' (فیروز) اور 'پتر' (آصفیہ) دونوں غلط ہیں۔ 'پتر' تو اردو میں ہے ہی نہیں، اور 'پسر' اردو کے روزمرہ میں نہیں ہے، صرف مخصوص تراکیب میں، یا مجرد طور پر شاعری میں صرف ہوتا ہے۔

لہٰذا لغت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرادفات بیان کرتے وقت کسی اصول ترجیح کا لحاظ رکھے، اور اس سے زیادہ ضروری یہ کہ فضول مرادفات سے مکمل پرہیز کیا جائے۔

لفظ 'پوت' پر گفتگو کے دوران یہ بھی واضح ہوا ہوگا کہ ہمارے لغات نے الفاظ کے محل استعمال اور کثرت استعمال کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ انھیں 'پوت' کے بارے میں بتانا تھا کہ اردو میں یہ

لفظ مجرد نہیں استعمال ہوتا، ہمیشہ کسی فقرے یا محاورے یا کہاوت میں وارد ہوتا ہے۔موجودہ اندراجات کی روشنی میں اگر کوئی طالب علم جملہ بنائے:

میں اپنے والدین کا تیسرا پوت ہوں۔

تو استاد اسے غلط قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ لغات میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے کہ تنہا لفظ 'پوت' اردو کے روزمرہ میں نہیں ہے۔یا پھر استاد بتائے گا کہ لغات کے اندراجات ناقص ہیں، کیونکہ ان میں محل استعمال نہیں بتایا گیا۔

اگر کوئی کہے کہ محل استعمال بتانا لغت نگار کا منصب نہیں،تو جواب یہ ہوگا کہ لغت کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں زبان کو سمجھنے اور برتنے کی قدرت عطا کرے۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو لغت الفاظ کا بے جان مجموعہ بن کر رہ جائے گا۔ ہر اچھا لغت اپنی وسعت اور بساط بھر طالب علم کو اتنی روشنی ضرور مہیا کرتا ہے کہ جس کے بل پر وہ زبان کا مزاج شناس نہ سہی، لیکن زبان داں بن سکے۔مثال کے لیے میں نے *Oxford English Dictionary* کو یوں ہی بے ارادہ کھولا تو لفظ 'Lustre' پر نظر پڑی، کہ جس کے معنی ہم جانتے ہیں کہ 'چمک' ہیں۔اب دیکھیے کہ *Oxford English Dictionary* اس کے بارے میں کیا کہتی ہے۔پورا اندراج بہت طویل ہے، میں صرف اولین عبارت کا اقتباس نقل کرتا ہوں:

Lustre

The quality or condition of shining by reflected light;

sheen, refulgence, gloss.

Often with adjective, as *metallic*, *pearly*, *silky*, *waxy*

lustre

آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اس لغت کے بنانے والوں نے طالب علم کی رہنمائی اور اسے غلط فہمی سے بچائے رکھنے کے سب وسائل مہیا کر دیے ہیں۔بڑی بات یہ کہ انھوں نے غیر ضروری مرادفات نہیں درج کیے ہیں، مثلاً انھوں نے 'Lustre' کے معنی میں Brilliance, Sparkle, Flash وغیرہ نہیں لکھے، کیونکہ یہ 'Lustre' کے معنی کو صحیح طور پر نہیں ادا کرتے، اگر چہ انھیں 'Lustre'

کے معنی سے بعید نہیں کہا جا سکتا۔

اس کے بر خلاف، اردو لغت، تاریخی اصول پر میں لفظ 'چمک' کی تفصیل یوں درج ہے:

چمک:-۱۔ جھلک، روشنی، تابانی

اس کے بعد میر سوز کا شعر درج ہے:

غرفے کو جھانکیو تو کیسی چمک ہے واللہ
ہے نور یا تجلی خورشید یا ستارہ

لیکن 'ستارہ' کو 'ستارا' مع الف لکھا ہے جس کی وجہ میں نہ سمجھ سکا۔ اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ 'چمک' کے اولین معنی، یا اس کا اولین مرادف 'جھلک' لکھا گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ 'جھلک' کو 'چمک' کا مرجح مرادف قرار دینا مناسب ہو گا، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جہاں جہاں 'چمک' لکھ بول سکتے ہیں وہاں وہاں 'جھلک' بھی لکھ بول سکتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ 'جھلک' کے ایک معنی 'چمک' بھی ہیں، لیکن بہت بعید۔ 'چمک' کے مرادف کے طور پر 'روشنی' بھی بہت مناسب نہیں، کیونکہ 'چمک' کی جگہ 'روشنی' کا لفظ ہر جگہ مناسب نہ ہو گا۔ مثلاً ہم 'نگینے کی چمک' تو کہہ سکتے ہیں لیکن 'نگینے کی روشنی' نہیں کہہ سکتے۔ 'تابانی' البتہ درست مرادف ہے اور اسے اول مرادف کے طور پر رکھنا چاہیے تھا۔ اردو لغت نے 'چمک' کے اور بھی معنی درج کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو محض مرادفات کا حکم رکھتے ہیں، مثلاً 'آب و تاب' جسے 'تابانی' کے ساتھ رکھنا تھا نہ کہ الگ معنی کے طور پر۔

آصفیہ میں بھی 'چمک' کے ایک معنی 'جھلک' لکھے ہیں، لیکن اول معنی (یا مرادف) 'روشنی' لکھے ہیں۔ مگر ایک مشکل یہ ہے کہ 'جھلک' کو اول مکسور کے ساتھ، یعنی 'جِھلک' لکھا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ آصفیہ میں جہاں لغت 'جھلک' درج ہے، وہاں صاف صاف اول مفتوح ہی لکھا ہے۔ لہٰذا 'جِھلک' کو کتابت کی غلطی فرض کرنا چاہیے۔

نور نے 'چمک' کے اولین معنی 'قوت، قدرت، بیشی، افزونی' لکھے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے یہ معنی انھوں نے کہاں سے برآمد کیے۔ دوسرے نمبر پر جو معنی ہیں ان میں اول 'روشنی' ہے اور دوم پھر وہی 'جھلک'۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ لفظ 'چمک' کے مرادف (یا معنی) لکھنا کافی تھا یا اس کی تعریف بھی لکھنا ضروری تھا؟ اگر ہم یہ فرض کریں کہ لغت دیکھنے والا اردو میں بہت ماہر نہیں ہے تو ممکن ہے جہاں اسے 'چمک' کے معنی نہ معلوم ہوں وہاں 'تابانی' اور 'آب و تاب' کے بھی معنی نہ معلوم ہوں گے۔او کسفرڈ ڈکشنری نے اسی احتیاط کے پیش نظر لفظ 'Lustre' کے مرادف کے ساتھ ساتھ اس کے معنی بھی لکھے ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مرادف نگاری میں بے احتیاطی اور لغات کا محل استعمال بتانے کا التزام نہ کرنا، یہ دو مسائل، یا عیوب ہیں جو کم و بیش ہمارے تمام لغات میں مشترک ہیں۔ ہماری ضرورت کے لیے جامع لغت وہ ہوگا جس میں زمانۂ حال کے استعمالات کا بیش از بیش احاطہ کیا گیا ہو۔جیسا کہ میں نے پہلے کہا، جن اردو-انگریزی لغات پر آج کل عموماً تکیہ کیا جاتا ہے وہ بہت پرانے ہیں۔اردو کے دو مستند اور نسبتاً مختصر لغات، یعنی آصفیہ اور نور بھی بہت پرانے ہیں۔اول الذکر کو سو برس سے زیادہ ہو گئے اور مؤخر الذکر کو سو برس ہونے والے ہیں۔اس سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مجروح صاحب مرحوم نے ایک بار مجھے لکھا کہ تم خود تو اچھی اور صحیح زبان لکھنے کا بہت اہتمام کرتے ہو لیکن تمھارے متبعین ایسا نہیں کرتے اور زبان کو نت نئے غیر ٹکسالی استعمالات سے بھرتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ زبان بدلتی رہتی ہے لیکن اکثر لوگ، حتیٰ کہ زبان کے معتبر استعمال کرنے والے صاحبان بھی اس حقیقت سے صرف نظر کرتے ہیں۔ پھر میں نے ان کے مجموعۂ کلام کے شروع کے بیس صفحوں میں سے کوئی پچیس لفظ اور محاورے نکال کر ان کی خدمت میں پیش کیے اور عرض کیا کہ نور اللغات ان سے خالی ہے۔مجروح صاحب نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، شاید خفا ہو گئے ہوں گے۔

بہر حال، یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ آصفیہ اور نور کے زمانے سے اب تک ہماری زبان میں کئی ہزار الفاظ اور فقرے داخل ہو چکے ہیں اور ہزاروں نہیں تو سیکڑوں لفظوں کے معنی بدل چکے ہیں۔ ہمارے اکثر لغات ان سے خالی ہیں کیونکہ ہمارے لغت نویسوں کو زبان کی زندہ صورت حال سے کچھ دلچسپی نہیں ہے۔ جو زبان روزمرہ استعمال میں آتی ہے وہ ادبی زبان پر مبنی تو ہوتی ہے، لیکن اس سے

مختلف بھی ہوتی ہے۔اس میں بہت کچھ ایسا شامل رہتا ہے ادبی زبان تک جس کو بار نہیں ہوتی۔

زمانۂ حال کے کسی بھی لغت نگار کو زبان کے کارپس (corpus) پر تکیہ کیے بغیر اپنے لغت کے مکمل طور پر کار آمد ہونے اور اس کے معاصر اور جدید ہونے کا گمان نہیں ہونا چاہیے۔لیکن ہوتا یہی ہے کہ کچھ پکے جو بھی لغات اس وقت موجود ہیں، وہ گذشتہ لغت نویسوں کو دیکھ کر اور ان کی تقلید میں بنائے گئے ہیں۔اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں کارپس (corpus) کی تعریف حسب ذیل ہے:

> The body of written or spoken material upon which a linguistic analysis is based.

توقع کی جاتی ہے کہ زمانۂ حال کا لغت نویس کم سے کم اقبال کے کلام کو تو اپنے کارپس میں شامل کرے گا۔نسیم امروہوی مرحوم کی فرہنگ اقبال (اردو) کو میں نے بے ارادہ کھولا تو معلوم ہوا کہ صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۷ (آدھا صفحہ) یعنی ڈیڑھ صفحات میں دو اندراج ایسے ہیں جو فیروز اللغات سے غیر حاضر ہیں:

بیشۂ تحقیق؛ بیابے کواکب

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ محض اقبال کے کلام میں کتنے الفاظ وتراکیب ہوں گے جو فیروز میں درج نہیں ہیں۔اردو لغت، تاریخی اصول پر اردو کا واحد لغت ہے جس میں کارپس کو مدنظر رکھا گیا ہے۔('بیشۂ تحقیق' اور 'بیابے کواکب' سے یہ لغت بھی خالی ہے۔ممکن ہے مرتبین کے خیال میں یہ تراکیب لغت بننے کے لائق نہ ہوں۔) اس بات سے قطع نظر کہ اس میں اور طرح کے بھی اغلاط بہت ہیں، اردو لغت، تاریخی اصول پر کی بائیس جلدیں حاصل کرنا، اور وہ بھی پاکستان سے، ہما شما کے بس کا نہیں۔پاکستان کے ہونہار اور دقیقہ سنج حافظ صفوان محمد چوہان نے چند روزناموں کو کارپس کی بنیاد بنا کر ایک لغت تیار کیا تھا۔انھوں نے مجھ سے دیباچے کی فرمائش کی۔لیکن اس لغت کے جو نمونے انھوں نے بھیجے تھے ان کو دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔کراچی کے اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نے ایک اردو۔اردو لغت تیار کیا ہے۔اس کے لیے بعض جدید متون کو کارپس کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔لغت کے چند اجزا میرے پاس تبصرے کے لیے بھیجے گئے۔مجھے وہ لغت بہت ناقص معلوم

ہوا، لیکن مرتبین لغت کو میری رائے سے اتفاق نہ ہوا۔ مطبوعہ شکل میں وہ لغت میں نے دیکھا نہیں ہے، لہٰذا مزید کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

یہ بات درست ہے کہ روزناموں کو بنیادی کارپس مان کر جدید اردو کا لغت تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستان کے اردو روزناموں کی زبان اس قدر ناقص ہے کہ اسے اردو کہتے ہوئے خوف آتا ہے کہ کیا یہ وہی زبان ہے جو میر و غالب و انیس و اقبال کے صفحات پر نظر آتی ہے؟ اس وقت تو سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ زمانۂ حاضر (یعنی اندازاً بیسویں صدی کے نصف دوم سے لے کر آخر تک) کے سر برآوردہ مصنفین کی سب کتابیں نہیں تو منتخب کتابیں ہی کارپس بنانے کے لیے منتخب کی جائیں اور اس کارپس کی بنیاد پر جدید اردو کا لغت بنایا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زمانۂ حاضر کے پہلے کے ادیبوں کے کارپس پر مبنی لغت ضروری نہیں، لیکن پرانے لغات کی موجودگی میں یہ کام اتنا اہم نہیں۔ اس سے زیادہ اہم کام تو یہ ہے کہ ہمارے دونوں مقبول ترین لغات، آصفیہ اور نور میں ضروری اضافے کر کے ان کے نئے ایڈیشن تیار کیے جائیں۔

لیکن اردو میں لغت نگاری تو حقیقت میں اس وقت کارآمد ہوگی جب لغت نگاری کے بنیادی اصول طے کر لیے جائیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ جو اصول بنیں وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں، لیکن کچھ اصول تو ہوں گے۔ اس وقت تو عالم یہ ہے کہ اردو کا کوئی لغت ایسا نہیں ہے جس میں لغت نگاری کے اہم ترین اور بنیادی اصولوں کی پابندی بالالتزام کی گئی ہو۔

لغت نگاری کے اصولوں پر میں اپنی گذشتہ تحریروں میں کچھ خامہ فرسائی کر چکا ہوں۔ بہر حال، اس وقت اختصار کے ساتھ بعض اہم اصول و مسائل کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں:

(۱) حروف تہجی کی تعداد و ترتیب کا تعین

(۲) الفاظ کی ترتیب کا تعین، یعنی الفاظ کا اندراج کس ترتیب سے ہو

(۳) الفاظ کے معنی، مرادف، اور تعریف میں فرق

(۴) الفاظ کے معنی، مرادف، یا تعریف جو بھی درج کیے جائیں ان میں ترتیب کیا ہو؟ اس کی تفصیل آگے آتی ہے:-

(۴ الف) غیر زبانوں کے الفاظ کے معنی: اصل زبان کی رو سے صحیح ترین معنی درج کیے جائیں یا اصل زبان میں جو معنی ہیں، اگر وہ اردو میں رائج نہیں ہیں تو کیا انھیں نظر انداز کیا جائے؟

(۴ ب) قدیم ترین معنی پہلے لکھے جائیں یا وہ معنی پہلے لکھے جائیں جو آج مروج ہیں؟

(۴ ج) کچھ الفاظ کی تعریف اور مرادف دونوں لکھنا ضروری ہو سکتا ہے، خاص کر ایسے الفاظ جو روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں، مثلاً کھانا (مصدر)، آنکھ (عضو بدن)، لڑائی (اسم)۔ ایسی صورت میں مرادف پہلے لکھیں یا تعریف پہلے لکھیں؟ آصفیہ میں 'کھانا' (مصدر) کے بارے میں یوں ہے:

> کھانا (ہ) فعل متعدی۔ (۱) خوردن کا ترجمہ۔ تناول کرنا۔ نوش کرنا۔ بھوجن کرنا۔ [اس کے بعد تین لفظ مجھ سے پڑھے نہیں گئے] چٹ کرنا (۲) فرو بردن کا ترجمہ۔ نگلنا۔ حلق سے اتارنا۔ غٹکنا۔ ٹنکنا۔ پیٹ میں ڈالنا۔ ڈکارنا۔ بھکوسنا۔ وڑکنا۔ پھاڑنا۔ بھنبھوڑنا۔ جیسے شیر کا کسی کو کھا لینا۔

یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ لغت نگار نے تعریف، مرادف اور معنی میں فرق نہیں کیا ہے۔ مثلاً 'فرو بردن' اور اس کے معنی درحقیقت 'کھانا' کے استعاراتی معنی ہیں (اگرچہ استعاراتی معنی میں سے کچھ معنی آصفیہ نے غلط بھی لکھے ہیں، مثلاً 'بھکوسنا'؛ 'وڑکنا'؛ 'پھاڑنا، بھنبھوڑنا'۔ انھیں 'کھانا' کے مرادف نہیں کہہ سکتے۔ آصفیہ نے اس کے آگے 'ڈسنا، کاٹنا، ڈنک مارنا' بھی لکھے ہیں اور دلیل میں ایک فقرہ نقل کیا ہے، 'سانپ نے کھا لیا'۔ پھر خود ہی لکھا ہے کہ یہ عوامی بولی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی بالکل فرضی ہیں۔ اس کے بعد 'کھانا' سے متعلق محاورے درج کیے گئے ہیں۔ یعنی 'کھانا' فعل کی کوئی تعریف آصفیہ نے نہیں لکھی ہے۔ یہی حال نور اللغات کا ہے، لیکن کچھ بہتر۔ انھوں نے 'کھانا' کے آگے اس کی اصل (ھ) بتائی ہے، پھر لکھا ہے، تناول کرنا، نوش کرنا، حلق سے اتارنا'۔ اس کے بعد 'کھانا' کے استعاراتی معنی اور 'کھانا' سے متعلق محاورے لکھے ہیں۔ مگر اس اندراج کا بڑا حصہ آصفیہ سے نقل کیا گیا ہے۔ 'کھانا' فعل کی کوئی تعریف نہیں لکھی گئی ہے۔

اب فعل eat کی تعریف کے لیے اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری سے نہیں (کیونکہ وہ ہر ایک کی دسترس میں نہیں) *Random House Unabridged Dictionary* سے رجوع کریں تو حسب ذیل عبارت ملتی ہے:

v.t. To take into the mouth and swallow for nourishment; chew and swallow (food)

اس کے بعد اور بہت کچھ ہے، لیکن لفظ eat بمعنی 'کھانا' کی صحیح اور جامع و مانع تعریف کے لیے منقولہ بالا عبارت کافی ہے۔ یہ لحاظ میں رکھیے کہ اس لغت نے eat کے مرادفات بالکل نہیں لکھے ہیں اور ہمارے لغت نگاروں نے مرادفات کی بھر مار کر دی ہے اور پھر بھی 'کھانا' کے معنی سامنے نہ آئے۔

ان مثالوں سے یہ بھی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ معنی، مرادف، تعریف، یہ تین شقیں ہیں اور ان میں فرق کرنا ضروری ہے اور یہ بھی فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ ان میں تقدم کسے دیا جائے۔

(۴د) کچھ الفاظ کے مرادفات لکھنے سے کام چل سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اصول پہلے سے بنا لینا چاہیے کہ مرادفات کس ترتیب سے لکھے جائیں گے۔

(۵) عربی الاصل الفاظ کا تلفظ عربی اصل کے لحاظ سے لکھا جائے گا، یا اردو میں مروج تلفظ کے اعتبار سے؟ بعض فارسی الفاظ کے بھی تلفظ میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے۔

اس باب میں ہمارے لغت نگاروں نے کئی طرح کے طریقے اپنائے ہیں، لیکن زیادہ زور اس بات پر رہا ہے کہ عربی ہی تلفظ لکھا جائے، خواہ وہ اردو میں رائج نہ ہو۔ صرف پلیٹس نے اتنا اہتمام کیا ہے کہ اصل عربی تلفظ لکھ کر رائج تلفظ بھی لکھ دیا ہے لیکن اسے vulgar یعنی 'عامیانہ' کہا ہے۔ مثال کے طور پر، لفظ 'خلوت' کا تلفظ اول مفتوح سے لکھ کر پھر اول مکسور بتایا ہے اور اسے vulgar قرار دیا ہے۔ اسی طرح، 'خیال' کا تلفظ اول مفتوح سے لکھا ہے اور پھر اول مکسور بتایا ہے اور اسے vulgar قرار دیا ہے۔ نور میں 'خلوت' بکسر اول کو غلط اور بفتح اول کو صحیح لکھا ہے۔ 'خیال' کو بفتح اول لکھ کر پھر لکھا ہے کہ فارسی میں اول مکسور ہے۔ اردو میں کیا صحیح ہے، اس کی صراحت نہیں کی۔

پلیٹس نے فارسی الفاظ میں بھی یہ التزام کیا ہے کہ اگر کسی لفظ کے ایک سے زیادہ تلفظ رائج ہیں (یا وہ انھیں درست سمجھتے ہیں) تو انھوں نے سب تلفظ درج کر دیے ہیں (اول تلفظ کو غالباً ترجیح ہے)۔ مثلاً پلیٹس میں پہلے 'چراغ' مع اول مفتوح لکھا ہے، پھر اسے مع اول مکسور لکھا ہے۔ نور نے

کوئی فیصلہ نہیں کیا، کشف اللغات کے حوالے سے وہ 'چراغ' میں اول مکسوراور برہان قاطع کے حوالے سے اول مفتوح بتاتے ہیں۔ آصفیہ نے صرف اول مفتوح لکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر کسی لغت کا کام یہ ہے کہ وہ معاصر زبان کی صورت حال بتائے۔ غلط یا درست کا معروضی فیصلہ کرنا لغت کا کام نہیں اور نہ ہی ایسا کوئی معروضی فیصلہ ممکن ہے۔اور نہ ہی یہ اصول درست ہے کہ عربی فارسی الفاظ کا تلفظ اردو کے لغت میں بھی وہی بتایا جائے جو اصل عربی یا فارسی میں ہے، کیونکہ اس طرح سے تو اردو زبان کی حیثیت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔یعنی اردو کو غیر زبانوں کا تابع مانا جائے گا۔ زبان کی بنیاد جمہور پر ہے۔یعنی یہاں سماع کو ہر بات میں فوقیت حاصل ہے۔قیاس بھی اسی حد تک درست مانا جائے گا جس حد تک وہ سماع کے موافق ہے۔

معاصر زبان کی صورت حال بیان کرنا لغت نگار کا فرض ہے۔اسی بنا پر، ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ کوئی لغت ہمیشہ کے لیے درست نہیں ہوتا۔یہ بات بالکل ظاہر اور مستند ہے، لیکن ہمارے لغت نگاروں نے اسے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے اور وہ پرانے معنی اور تلفظ کو ہر شے پر فوقیت دیتے رہے ہیں۔ لفظ 'چمک' کے معنی کی مثال اوپر گذر چکی ہے، کہ اردو–اردو لغات نے اس کے معنی 'جھلک' بھی لکھے ہیں۔ممکن ہے کسی زمانے میں 'چمک' کو 'جھلک' کے معنی میں بھی برتتے ہوں (اردو لغت، تاریخی اصول پر میں صرف ایک سند فسانۂ آزاد سے دی ہے۔ظاہر ہے کہ فسانۂ آزاد کا سنہ تصنیف ۱۸۸۰ء ہے لہٰذا اسے کسی طور پر بھی معاصر اردو کی صورت حال کی آئینہ دار نہیں کہہ سکتے۔) آج تو مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص 'جھلک' اور 'چمک' کو مترادف نہ سمجھے گا۔لیکن اس کو کیا کریں کہ جن لغات کا ہم نے حوالہ دیا، سب میں یہی درج ہے۔

(۶) ایسا نہیں ہے کہ صرف عربی الاصل یا فارسی الاصل الفاظ کے تلفظ میں اشکال ہو سکتا ہے۔ٹھیٹ اردو کے بھی الفاظ میں تلفظ کا اشکال یا شک ہو سکتا ہے، مثلاً 'پہ' حرف جار اور 'پہ' حرف عطف دو الگ لفظ ہیں، لیکن اردو میں دونوں کا ایک ہی مخفف 'پَہ' رائج ہے۔سوال یہ ہے کہ اس کا تلفظ 'پَہ' مع اول مفتوح ہو، یا 'پِہ' مع اول مکسور؟ پلیٹس نے دونوں کے لیے 'پَہ' مع اول مفتوح لکھا ہے۔ شیکسپیئر نے 'پہ' حرف جار کا مخفف 'پَہ' مع اول مفتوح لکھا ہے لیکن 'پہ' حرف عطف کا مخفف کچھ نہیں دیا۔

ڈنکن فوربس کے یہاں مجھے 'پَہ' یا 'پِہ' بطور مخفف نہیں ملا۔ نور میں لکھا ہے کہ دونوں معنی میں 'پَہ' کو 'لکھنؤ میں بہ فتح حرف اول اور دہلی میں بکسر حرف اول بولتے ہیں۔' ظاہر ہے اس کی دلیل کچھ بھی نہیں ہوسکتی، ہمیں لغت نویس کے بیان پر اعتبار کرنا ہو تو کریں۔ اگر دہلی کی زبان کے لیے آصفیہ کو معتبر مانیں تو وہاں صاف درج ہے کہ 'پَر' حرف جار (اسے وہ ظرف مکان کہتے ہیں) اس کا مخفف 'پِہ' بکسر اول ہے اور 'پَر' حرف عطف (اسے وہ حرف استثنا کہتے ہیں) اس کا مخفف 'پَہ' بفتح اول ہے۔ ایسی صورت میں نور کا بیان غیر معتبر ٹھہرتا ہے۔

اردو لغت، تاریخی اصول پر میں دونوں ہی حرکات درج کر دی گئی ہیں۔ یعنی ان کے حساب سے 'پَہ' بفتح اول بھی ٹھیک ہے اور 'پِہ' بکسر اول بھی ٹھیک ہے۔ اتنے بڑے لغت کے مؤلفین اتنے اہم اور کثیر الوقوع لفظ کے تلفظ کے بارے میں مبتلائے شک رہیں، یہ افسوس کی بات ہے۔

آج کی صورت حال کم و بیش وہی ہے جو آصفیہ نے بیان کی۔ یعنی 'پَر' حرف جار کا مخفف بکسر اول ہے اور 'پَر' حرف عطف کا مخفف بفتح اول ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کے بولنے والے پوری طرح محتاط نہیں ہیں، اس لیے کبھی کبھی اس لفظ کے تلفظ میں بھی غلط کر دیتے ہیں۔ شعروں سے مثال لی جائے تو بات فوراً واضح ہو جائے گی کہ آصفیہ کا بیان مبنی بر حقیقت ہے:

چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش
کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش[1]

جنازے پہ آئی نہ تھی وہ پری
ہوئی گور پر اس کی جلوہ گری[2]

سب کی تو بسلتیں ہیں پہ یاروں کا بسنا[3]

ہے نقش ترا نام پری رو! مرے دل پر
ہے نام تو اچھا پہ نگینہ نہیں اچھا[4]

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا[5]

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا[۶]

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب[۷]

اسی طرح، مصدر 'چھپنا/ چھپانا' کے تلفظ کا معاملہ ہے۔ پلیٹس نے ان کے لیے اول مکسور اور اول مضموم دونوں لکھے ہیں لیکن فوقیت بظاہر مکسور کو ہے، کیونکہ پہلا اندراج مکسور کا ہے۔ قدیم تر لغات دیکھیں تو شیکسپیئر نے 'چھپانا' میں اول مکسور کو فوقیت دیتے ہوئے دوسرے نمبر پر اول مضموم کو رکھا ہے اور اس کے بعد اول مفتوح 'چھپنا' بھی لکھا ہے جو کہیں سننے میں نہیں آیا۔ شیکسپیئر نے اول مفتوح یعنی 'چھپنا' کو 'چھپنا 'اور 'چھپنا' پر فوقیت دی ہے۔ شیکسپیئر (۱۸۳۴ء) کے قریب العہد جوزف ٹامپسن (Joseph Thompson, 1838) کا لغت ہے۔ اس میں 'چھپنا' (بالکسر)، پھر 'چھپنا' (بالفتح) اور پھر 'چھپنا' (بالضم) لکھا ہوا ہے۔ لیکن 'چھپانا' (بالکسر)، پھر 'چھپانا' (بالضم) اور پھر 'چھپانا' (بالفتح) لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ ترتیب سہو کی بنا پر ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ 'چھپنا' اور 'چھپانا' بمعنی to hide, to conceal بھی تلفظ کسی زمانے میں تھا۔

اردو لغت، تاریخی اصول پر حسب معمول بے اصول ہے۔ اس میں صرف 'چھپانا' بالضم درج ہے۔ لیکن مصدر 'چھپنا' میں دونوں حرکات، ضمہ اور کسرہ لکھی گئی ہیں۔ تاریخی اصول کی پابندی کی جاتی تو 'چھپنا/چھپانا' بالفتح بھی درج کیا جاتا کہ یہ بھی ایک قدیم تلفظ ان الفاظ کا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ارباب اردو لغت کے خیال میں 'چھپانا' بالکسر غلط ہو لیکن 'چھپنا' اور 'چھپنا' بالضم یا بالکسر دونوں ٹھیک ہوں۔ کیونکہ اس لغت میں بھی لغت نویسان پیشیں کی صوابدید پر صحیح/غلط کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ حال آنکہ لغت نویس کا منصب صرف رائج صورت حال کو بیان کرنا ہے، کہ زبان کے معاملے میں وہی صحیح ہے جو رائج ہو۔ آصفیہ میں صرف 'چھپانا/چھپنا' (بالضم) مرقوم ہے، لیکن نور نے یہاں صحیح لکھا ہے کہ لکھنؤ میں بالکسر اول ہے اور دہلی میں بالضم اول۔

اسی طرح، ایک لفظ 'غبارہ' ہے۔ پلیٹس کے یہاں یہ مع تسہیل حرف دوم ہے، پھر یہ لکھا ہے

کہ مع تشدید حرف دوم vulgar یعنی عامیانہ تلفظ ہے۔ املا کے اعتبار سے پلیٹس کے یہاں اس لفظ کا آخری حرف ہائے مختفی، یا ہائے ہوز ہے۔ پلیٹس نے اسے فارسی لکھا ہے جو درست نہیں ہے، کیونکہ فارسی لفظ 'غبارہ' مع اول مکسور و ہائے ہوز ہے اور یہ بیلوں یا دوسرے جانوروں کو ہانکنے کی لکڑی کے معنی میں آتا ہے۔ اسٹائنگاس (Steingass) نے غالباً بے سمجھے اس کے معنی balloon لکھ دیے لیکن یہ معنی بے سند اور بے اصل ہیں۔ پلیٹس نے جو معنی لکھے ہیں ان میں ہمارا مانوس غبارہ یا balloon نہیں ہے جس کو بچے اڑاتے اور کھیلتے ہیں (اور اکثر اسے 'بیلون' کہتے بھی ہیں)، بلکہ پلیٹس کی رو سے 'غبارہ' ایک طرح کا بم ہوتا ہے، یا پھر آتشی غبارہ جو کاغذ یا کپڑے کا ہوتا ہے اور جس کے نیچے انسانوں کے بیٹھنے کا ڈبہ سا بنا ہوتا ہے، وغیرہ۔ پلیٹس نے آخر میں لفظ balloon ضرور لکھا ہے، اور اس سے غالباً ربر کا غبارہ مراد لی ہے لیکن یہ مشکوک ہے کہ پلیٹس کے زمانے میں ہمارے یہاں کے ربر کے غبارے موجود تھے۔ لہٰذا ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ لفظ balloon سے پلیٹس نے آتشی غبارہ مراد لی ہے۔

آصفیہ اور نور نے جو معنی درج کیے ہیں وہ پلیٹس پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ آصفیہ نے بہت وضاحت سے کام لیا ہے، لیکن ربر کا غبارہ واضح طور پر نہیں لکھا۔ تلفظ اور املا کے لحاظ سے دیکھیں تو آصفیہ نے بہ تسہیل دوم اور آخری حرف الف لکھا ہے۔ نور نے بھی ایسا ہی کیا ہے لیکن انھوں نے ایک معنی 'ایک قسم کا ہوائی جہاز' خدا جانے کہاں سے لکھ دیے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان لغات کو 'غبارہ/غبارا' کے جدید معنی اور تلفظ کی سند میں نہیں استعمال کر سکتے۔

فیروز نے سب معنی پلیٹس اور آصفیہ کی اتباع میں لکھے ہیں، لیکن آخر میں 'بیلون' اور انگریزی میں baloon لکھا ہے، مگر ایک ہی 'L' سے۔ تلفظ اور املا ان کا بھی آصفیہ کے مطابق ہے۔ اردو لغت نے جدید معنی کو سب پر فوقیت دی ہے اور بالکل صحیح کیا ہے۔ ان کے املا کے حساب سے تحتانی پر تشدید ہے اور نہیں بھی۔ یہ بات بھی درست ہے۔ ان کا آخری حرف ہائے ہوز ہے۔ یہ جدید معنی کے لیے تو درست ہے، لیکن قدیم معنی (یعنی بم، بم پھینکنے کا آلہ، آتش بازی، آتشی غبارہ وغیرہ) کے معنی کے لیے اس املا کو مختلف فیہ کہا جائے گا۔

میں نے غبارے میں اتنی ہوا اس لیے بھری کہ یہ بات آپ پر ظاہر ہو جائے کہ الفاظ اپنا املا، معنی، جنس، سب کچھ بدل سکتے ہیں اور ہمارے لغات ان معاملوں میں اکثر بے احتیاط ہیں۔

کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی ہے، لیکن مضمون یوں ہی بہت طویل ہو چکا ہے۔ بس ایک بات اور عرض کر کے سمع خراشی بند کروں گا۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ نـــور میں 'کھانا' درج کر کے اس کے آگے قوسین میں ہاے دوچشمی (یعنی ھ) لکھی ہے۔ تو یہ ہاے دوچشمی (یعنی ھ) کیا بلا ہے؟ بظاہر یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ لفظ 'کھانا' ہندی لفظ ہے، یا ہندی الاصل ہے۔ یعنی یہ لفظ ہندی سے اردو میں آیا۔ آصــفیہ میں 'کھانا' کے آگے قوسین میں ہاے ہوز (ہ) درج ہے۔ اب کچھ سوال اٹھتے ہیں جو نیچے لکھتا ہوں:

(۱) 'ہندی' کی علامت ہاے دوچشمی (یعنی ھ) کو کیوں ٹھہرایا؟ کیا لفظ 'ہندی' کا املا ہمارے یہاں ہاے دوچشمی سے ہے؟ [ظاہر ہے کہ لفظ 'ہندی' کا املا ہمارے یہاں ہاے ہوز سے ہے۔ ہاے دوچشمی (یعنی ھ) کا یہاں کوئی گذر نہیں۔ لغت نگار نے 'ہندی' کے اشارے کے لیے ہاے دوچشمی (یعنی ھ) کا استعمال کر کے غلطی کی ہے اور غلطی پھیلائی بھی ہے۔ میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو آج بھی 'ہندی' اور 'ہندوستانی' کو ہاے دوچشمی (یعنی ھ) سے 'ھندی' اور 'ھندوستانی' لکھتے ہیں۔ اسے غلط الحقاہی کہنا پڑے گا۔]

(۲) اگر 'کھانا' ہندی (یا 'ھندی') لفظ ہے تو پھر اردو لفظ کیا ہے؟ اور یہ ہندی (یا 'ھندی') لفظ اردو کے لغت میں کیوں داخل کیا جا رہا ہے؟ [ظاہر ہے کہ لغت نگاروں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے لغت میں ھندی، فارسی، عربی، انگریزی، ہر طرح کے الفاظ ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اردو الفاظ نہیں ہیں۔]

(۳) اگر 'کھانا' کے آگے ہاے ہوز (ہ) یا ہاے دوچشمی (ھ) لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ ہندی سے اردو میں آیا، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی زبان 'ہندی' نام کی ہے اور وہ اردو کے پہلے سے ہے؟ یا اگر پہلے سے نہیں ہے تو الگ ایک زبان ہے اور اسی لیے 'ہندی' کا لفظ اردو میں دخیل ہوا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو لفظ 'کھانا' کے 'ہندی' سے اردو میں آنے کے پہلے ہم لوگ 'کھانا' یعنی to eat کے

لیے کیا بولتے تھے؟[ظاہر ہے کہ اردو کے الفاظ کو 'ہندی' بتانا بالکل غیر تاریخی اور بے بنیاد ہے۔ 'ہندی' نام کی کوئی الگ زبان نہیں تھی۔ اردو کے قدیم ناموں میں 'ہندی'، 'ہندوی' بھی ہیں اور یہ نام کم از کم مصحفی کے زمانے (۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء) تک رائج تھے۔ جدید ہندی (یعنی ناگری حروف میں لکھی ہوئی کھڑی بولی) جیسی کہ آج مستعمل ہے، اردو زبان کے بہت بعد میں وجود میں آئی۔ اردو الفاظ کو ہندی بتا کر لغت نگاروں نے اردو پر ظلم عظیم کیا ہے۔]

(۴) آخری سوال یہ ہے کہ وہ کون سے لفظ ہیں جنھیں 'اردو' کہا جائے گا؟ مثال کے طور پر، پلیٹس میں 'ٹھنٹا' (بجائے 'ٹھنٹھہ') لکھ کر اسے 'H' لکھا ہے جس سے غالباً ہندوستانی مراد ہے۔ آصفیہ میں 'ٹھنٹا' (بجائے 'ٹھنٹھہ') درج کر کے اسے 'اردو' کہا گیا ہے۔ نور نے بھی 'ٹھنٹا' (بجائے 'ٹھنٹھہ') لکھ کر اسے 'ہندی' بتایا ہے، حال آنکہ 'ہندی' اگر کوئی زبان پہلے کبھی تھی بھی تو اس میں نہ 'ٹ' ہے اور نہ 'ٹھ'۔ پھر یہ لفظ 'ہندی' کہاں سے ہوا؟[حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے تقریباً آخر تک ہمارے اساتذۂ زبان، لغت نویس اور ماہرین لسانیات اکثر اس گمان کے تھے کہ جو لفظ اردو میں داخل ہیں، اگر وہ انگریزی، فارسی، عربی وغیرہ نہیں ہیں تو وہ 'ہندی' ہیں۔] فیروز میں 'ٹھنٹا' مع الف درج ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اسے اردو لکھا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ تو ہمیشہ مع ہائے ہوز رائج رہا ہے، ان صاحبان نے 'ٹھنٹھہ' کو 'ٹھنٹا' مع الف کیوں لکھا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ رائج بلا سے مع الف ہو، لیکن 'صحیح' تو ہائے ہوز سے ہے۔ ایسا کیوں؟ اس لیے کہ لغت نگار کو رائج زبان سے غرض نہیں، وہ غلط اور صحیح کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ لغت نویسوں کے خیال میں 'ہائے مختفی' کا وجود 'ہندی' میں نہیں ہے۔ اگر 'ٹھنٹا' زبان 'ہندی' کا لفظ ہے تو اسے مع الف ہی لکھنا چاہیے۔ ہمارے لغت نویسوں کو 'ہے' سے زیادہ 'چاہیے' سے غرض ہے۔

اردو میں ہائے مختفی ہو گی، لیکن ہمارے ماہرین اس سے ناواقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اکثر 'ماہرین' کو ہائے مختفی کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ وہ عربی کے الفاظ مثلاً 'جلوہ'، 'فائدہ' میں ہائے مختفی فرض کر سکتے ہیں اگر چہ عربی میں ہائے مختفی کا وجود نہیں، لیکن ہمارے لغت نگار 'ہندی' (یعنی جس

زبان کو وہ ہندی کہتے ہیں) اس میں ہائے مختفی کے وجود سے منکر ہیں۔ اور غالباً اس بات سے بھی وہ ناواقف ہیں کہ اردو الگ سے کوئی زبان بھی ہے۔ لیکن صاحب فیروز شاید یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر کسی لفظ میں 'خ' وارد ہو تو وہ اردو ہونا چاہیے۔ انھوں نے 'ٹرخانا' درج کیا ہے اور اسے 'اردو' لکھا ہے۔ لیکن وہ 'ٹرکانا' نظر انداز کر گئے، حال آنکہ یہ 'ٹرخانا' کے مقابلے میں کثیر الوقوع ہے۔ یا ان کا خیال رہا ہوگا کہ اگر 'خ' نہیں تو اردو بھی نہیں، مثلاً انھوں نے 'پٹخنا' مع خائے معجمہ کو اردو لکھا ہے اور 'پٹکنا' مع کاف عربی کو 'ہندی' لکھا ہے۔

اس طرح کی افراتفری اردو لغت میں بھی ہے۔ انھوں نے 'پٹخنا' کو اردو تو بتایا ہے، لیکن اس کی 'اصل' ان کے خیال میں 'پٹکنا' ہے جو ان کی رائے میں 'ہندی' ہے۔ یعنی 'پٹخنا' اس لیے 'اردو' ہے کہ اس میں خائے معجمہ ہے اور 'پٹکنا' اس لیے 'ہندی' ہے کہ اس میں کاف عربی ہے۔ قربان جائیں ایسی لغت نویسی پر۔

ابھی تک ہم لوگوں کے ذہن میں یہ بات بظاہر صاف نہیں ہے کہ کسی لسان کو 'زبان' کا اصطلاحی نام دینے سے کیا مراد ہے؟ ہم لوگ اردو کے دیسی الفاظ کو 'ہندی' کہنے پر کیوں مصر ہیں؟ اگر جواباً یہ کہا جائے کہ کسی لفظ کو 'ہندی' کہنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ لفظ ہندی سے ہماری زبان میں آیا، تو پھر اتنا کہنا کافی نہیں۔ لغت نویس کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ وہ لفظ 'ہندی' سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اگر ان کی مراد اس سنسکرت آمیز کھڑی بولی سے ہے جو موجودہ زمانے میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، تو یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ دیوناگری رسم الخط میں سنسکرت آمیز کھڑی بولی کی عمر اردو کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یعنی اردو پہلے آئی اور سنسکرت آمیز کھڑی بولی جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اردو کے بہت بعد وجود میں آئی۔ اور خود اردو کے کئی پرانے نام تھے جن میں 'ہندی' بھی تھا۔

لہٰذا اردو کے دیسی الفاظ کو 'ہندی' بتانا طرح طرح کی غلطیوں اور غلط بیانیوں کو فروغ دیتا ہے۔ اور یوں بھی، کسی اردو لفظ کو ہندی الاصل کہنا کافی نہیں، کیونکہ خود وہ لفظ پالی، یا پراکرت یا سنسکرت سے ہندی میں آیا اور اس کے بارے میں اطلاع اسی وقت مکمل کہی جائے گی جب اس ہندی لفظ کی اصل کو سنسکرت، یا سنسکرت سے نکلنے والی زبانوں تک پہنچایا جائے۔ اس وقت تو ہمارے لغات یہ کہتے

ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ اردو کے اکثر لفظ ہندی ہیں، یا ہندی سے لیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

نوٹ: یہ مقالہ، لغت کانفرنس، مدراس یونی ورسٹی، چینئی، میں مارچ ۲۰۱۵ء کو بطور کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

حوالہ جات

* اردو کے معروف ادیب، نقاد اور فکشن نگار۔ نئی دہلی، انڈیا۔

۱۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد دوم (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۷۹۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۴۷۔

۳۔ نظیر اکبر آبادی، کلیاتِ نظیر (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، س ن)، ص ۴۱۳۔

۴۔ شیخ امام بخش ناسخ، کلیاتِ ناسخ، جلد دوم، حصہ اول (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۱۴۔

۵۔ مرزا غالب، دیوانِ غالب (کراچی: فضل سنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۷۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء)، ص ۴۵۵۔

مآخذ

آبادی، نظیر اکبر۔ کلیاتِ نظیر۔ لاہور: مکتبہ شعر و ادب، س ن۔

اقبال، محمد۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء۔

غالب، مرزا۔ دیوانِ غالب۔ کراچی: فضل سنز، ۱۹۹۷ء۔

میر، میر تقی۔ کلیاتِ میر۔ جلد دوم نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷ء۔

ناسخ، شیخ امام بخش۔ کلیاتِ ناسخ۔ جلد دوم۔ حصہ اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء۔